حوالہ
تنویر سیٹھی

نہیں تھا میں تو کبھی ہار ماننے والا
مگر کسی کا حوالہ دیا گیا مجھ کو

حوالہ

تنویر سیٹھی

باذوق لوگوں کے لئے
خوبصورت اور معیاری کتابیں
تزئین و اہتمام اشاعت
خالد بدر رانا، مامون طاہر رانا

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب: حوالہ
شاعر: تنویر سیٹھی
ناشر: غلام طاہر رانا پبلی شرز
سرورق: سلمان ناصر
کمپوزنگ: سلمان ناصر قادری
پرنٹر: فیصل فدا پرنٹرز
اشاعت: 26 فروری 2016ء
قیمت: -/400 روپے
تعداد: 1000

خوبصورت کتب کی اشاعت کیلئے رابطہ

غلام طاہر رانا پبلی کیشنز شاہ رکن عالم ملتان

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: تنویر اسلم سیٹھی

قلمی نام: تنویر سیٹھی

تعلیم: ایم اے اکنامکس جی سی یونیورسٹی لاہور

ایم بی اے فنانس ورچوئل یونیورسٹی لاہور

ایم اے اردو (جاری) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

چیئرمین: ادب اجالا فورم

صدر: بزمِ علم و فن انٹرنیشنل

تخلیقات: ۱۔شاخ سے لپٹی دھوپ ۲۔زرد رت کا چاند

۳۔صحرا میں پھول ۴۔ چراغ مرے ہم خیال ہیں

۵۔چھوڑ دیلاں آخر (مرتبہ انتخاب) ۶۔سب اشک مسافت کے (مرتبہ انتخاب)

۷۔ جو مجھ پہ گزری ہے ۸۔کھلتے ہیں پھول پانی کے

۹۔ یہ کیسی روانی ہے آنکھ میں ۱۰۔شام وصال

۱۱۔نخلِ جنوں ۱۲ بھیگی پلکیں نیند بھری (مرتبہ انتخاب) ۱۳ ہمارے ہیں حسین

پتہ: محمد لاج پلاٹ نمبر ۴۵۔۴۶ فرید ٹاؤن وہاڑی

فون نمبر: 03007731675

کھلتے ہیں پھول
پانی کے

انتساب

شهدائے کربلا کے نام

فہرست

☆ زندگی کے وہ شب و روز سنور جاتے ہیں	12
☆ فکر تازہ سے مری سوچ میں وسعت آئی	12
☆ اس کو منظور ہو تب ہاتھ اٹھا کرتے ہیں	13
☆ یہ لوگ جو مرا غم بانٹنے کو آئے ہیں	13
☆ کیا تھا وہ شخص مجھے خواب دکھانے سے قبل	14
☆ درد اپنا زباں بناؤں گا	14
☆ اس لئے چھوڑی نہیں ذات میں وحشت رکھنا	15
☆ کھڑے ہیں سامنے سرکار لیکن	15
☆ چھدے ہوئے ہیں لبوں کے کنار حرفوں سے	16
☆ میں اپنے آپ کو آپ سے جدا کرلوں	16
☆ موسم وصل کو بے شک نہ پکارو لوگو	17
☆ جو درد دے کسی کو بھلا آدمی نہیں	17
☆ یہ اشک شاخ شاخ پروئے ہیں مدتوں	18
☆ رخصت کے وقت دی تھی فقط اک دعا مجھے	18
☆ شریک کار رہواؤں کی سازشوں میں رہا	19
☆ وفا کے جھوٹے وعدے بیچتا ہے	19
☆ دل کی آواز سن گمان میں آ	20

☆ ہوا کا رخ مزاج اہل گلشن جانتا ہے	20
☆ شام ڈھل جائے تو منظر دیکھنا	21
☆ جو میرے حق میں تھی وہ شہادت بدل گئی	21
☆ تو مرے پیار کو نظر میں رکھ	22
☆ میں انقلاب پسندوں کی اک قبیل سے ہوں	22
☆ سامنے والی گلی سے جو گزر ہو جائے	23
☆ کر دیا ہے مری آزادی نے مجبور مجھے	23
☆ نشانہ باندھے ہوئے تیر بر کمان میں تھا	24
☆ سفر کی رائیگانی مار دے گی	24
☆ کہانی ابتدا کرنے سے پہلے ختم کرتے ہیں	25
☆ جاگتی رات کے منظر کو مری آنکھ میں دیکھ	25
☆ کیا نیا میں استعارہ دیکھتا ہوں	26
☆ یہ کس کی زباں بولنے لگ گیا ہوں	26
☆ پیاس پلکوں پہ جمی ہے اب بھی	27
☆ منزلِ راہِ وفا کتنی کڑی تھی	27
☆ لہولہو ہی سہی خواب زندگانی کے	28
☆ جب بھی کبھی ہمارے پر و بال کٹ گئے	28
☆ اور تو کوئی مسئلہ ہی نہیں	29
☆ مکاں اور لامکاں کے بیچ کچھ ہے	29
☆ دریاؤں کی روانی اتر آئی آنکھ میں	30
☆ گرمئ شوق سے گھبرائے ہوئے لوگ ہیں ہم	30
☆ کس سفر میں ہم سفر ہیں چاندنی میں اور وہ	31
☆ خزاں کے رنگ تھے حد بہار سے باہر	31
☆ ٹوٹا جو بندِ چشم، سہارا نہیں رہا	32

☆ شہر کو آباد ہونا تھا پہ بنجر رہ گیا	32
☆ رقصاں دلِ بے کل میں جو وحشت ہے ابھی تک	33
☆ سمندر میں سمندر جاگتا ہے	33
☆ نظر سے آگے رستہ ڈولتا ہے	34
☆ عشق پھر سے نیا اک ظرف پہن کر آیا	34
☆ حسابِ بیش و کم سے بھی زیادہ کر کے آیا ہوں	35
☆ توڑ کر ہجر کے پتھر سے نکل آیا ہے	35
☆ یقیں کروں تو اسی بات میں صداقت ہے	36
☆ فضائے حبس میں جھونکا بہت ضروری ہے	36
☆ عشق کی راہ میں بکھر کے سوچ	37
☆ جو ہیں مایوس ان میں آرزوئیں بانٹتا ہے	37
☆ کڑی دھوپ میں بھی کوئی شجر نہ اسے ملا نہ مجھے ملا	38
☆ جھیل میں اترا ہوا پیکر طلب کرتا رہا	38
☆ کب یہ چاہا تھا کہ میں چاند ستارہ ہوتا	39
☆ جو شجر دھوپ کی تردید نہیں کر سکتے	39
☆ دریا ہے یا ہے کوئی سمندر سمیٹ لے	40
☆ محبتوں کا کبھی آفتاب ابھرے گا	40
☆ تمہاری سمت یہ ہم جو مسلسل دیکھتے ہیں	41
☆ کوئی شکوہ نہیں ہے مجھ کو اپنے مہرباں سے	41

13

14

15

16

☆—☆

بہت سی خواہشات

سالہا سال میں اس حساس دل نے بہت کچھ دیکھا، بہت کچھ سہا جس کے نتیجے میں کبھی اکتاہٹوں کے دن اور کبھی خوشگوار لمحے سفرِ زیست میں نمودار ہوئے کمسنی کی سوچیں بھی اور بوڑھے خیالات بھی۔ بہت سی خواہشات جو الفاظ کے قالب میں ڈھل گیئں اور بہت سی آرزوئیں بین السطور بیان ہوئیں۔ جو بھی سوچیں اور تجربات روز وشب کا حصہ بنتے گئے ان میں سے کچھ قلم کی دسترس میں آسکا اور کچھ شعور سے تحت لشعور میں محفوظ ہوتا چلا گیا بہت سے خیالات وجذبات حرف و بیاں کی قید میں نہ آسکے۔ تنہائی کے لمحوں میں پہروں بیٹھ کر کی گئی خود کلامی سے چند رنگ اس کتاب میں شامل کر رہا ہوں جو یقیناً مرے قلب و ذہن میں ابھرنے والی چند تصاویر کا احاطہ کر پائیں مگر میں نے اپنی ذات میں جو کچھ محسوس کیا اور اپنی وجدان کی آنکھ سے جو کچھ دیکھا اسے من وعن بیان کر دیا ہے۔ آخر میں مَیں شاعر ادیب مامون طاہر رانا کا بھی شکریہ ادا کرتا کہ انہوں نے میری چاروں کتابوں کو اکٹھا کر کے آپ سب کے اور میرے حوالے کر دیا۔ اسی لئے ''حوالہ'' محتاجِ تعارف نہیں نہیں کہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ محبتوں کا شکریہ!

تنویر سیٹھی

0300-7731675

زندگی کے وہ شب و روز سنور جاتے ہیں
یادِ آقا کے سہارے جو گزر جاتے ہیں
چاند تارے بھی کریں رشک مقدر پہ ان کے
میرے محبوب کی چوکھٹ پہ جو مر جاتے ہیں
بس عقیدت سے پکارے جو انہیں کوئی تو
آپ خود چل کے غلامان کے گھر جاتے ہیں
سوچتے ہی وہ مدینے کی فضائیں یارو
ہم کسی نور کے دریا میں اتر جاتے ہیں
سر جھکانے مرے اس شاہِ امم کے آگے
آسماں ، جن و بشر شمس و قمر جاتے ہیں

☆

پاس اس کے نہ کبھی کوئی اذیت آئی
راس جس کو بھی ترے ہجر کی لذیت آئی
دستکیں دیتے ہوئے آج تری چوکھٹ پر
دیکھ اٹھ کر تو ذرا کس کی محبت آئی
میری خواہش تھی کسی شہر محبت میں بسوں
میری قسمت مرے حصّے میں مسافت آئی
جس گھڑی بجھتے چراغوں نے کام آنا تھا مرے
اس گھڑی کام مرے میری عبادت آئی
میں نے چاہا کہ مرے حرف امر ہو جائیں
شکر ہے نوکِ قلم پر تری مدحت آئی
چشمِ حیراں تری حیرت کی فسوں کاری سے
ان کہی لے کے مرے پاس وضاحت آئی
دشت سے جونہی کیا ترکِ تعلق تنویرؔ
دور تک روکنے مجھ کو مری وحشت آئی

اس کو منظور ہو تب ہاتھ اٹھا کرتے ہیں
اپنی مرضی سے کہاں لوگ دعا کرتے ہیں

گھر میں رہتے ہیں نہ گلیوں میں پھرا کرتے ہیں
رات دن تیرے خیالوں میں رہا کرتے ہیں

کبھی خوشبو نے درِ دل پہ جو دی تھی دستک
ہم تو اب بھی وہی آواز سنا کرتے ہیں

کیسے بدلو گے مرے شہر کے لوگوں کا مزاج
سنگ ریزے کبھی ہیروں میں ڈھلا کرتے ہیں؟

ہم فقیرانِ وفا خاک نشیں ہو کر بھی
آسمانوں کی بلندی پہ ہوا کرتے ہیں

کس کو ملتا ہے یہاں نور جہاں جیسا عشق
دوست کب تاج محل روز بنا کرتے ہیں

پیار سے مل ہمیں ہم ایسے نہیں ہیں تنویرؔ
بیچ منجدھار کے جو چھوڑ دیا کرتے ہیں

☆

یہ لوگ جو مرا غم بانٹنے کو آئے ہیں
انہیں خبر نہیں ہم خود شجر کے سائے ہیں

اسے تو بچھڑے زمانہ ہوا مگر مرے دوست
کہاں سے میری محبت کو ڈھونڈ لائے ہیں

اگر تو خواب کے پاتال میں چھپا ہوا ہے
تو ہم بھی تیری تہوں تک اتر کے آئے ہیں

وہی اب ان میں نئے راستے کرے پیدا
کہ جس نے مشکلوں کے دائرے بنائے ہیں

ترے خیال کے پیکر کی روشنی ہے یہ
مرے حروفِ ہنر جس سے جگمگائے ہیں

یہ اتفاق نہیں جان بوجھ کر ہم نے
چراغ جو تری امید کے بجھائے ہیں

ہماری روح کو اب ساتھ لے کے جائیں گے
کہ یہ پرندے بڑی دور سے بلائے ہیں

کوئی تو نقش سرِ چاک ابھر کے آئے گا
کہ ہم نے خواب بھی تو خاک میں ملائے ہیں

کیا تھا وہ شخص مجھے خواب دکھانے سے قبل — کیا تھا میں بھی کسی کے جال میں آنے سے قبل
ٹوٹنا ضبط کا کمزور بنا دیتا ہے — کیا ارادے تھے مرے اشک بہانے سے قبل
کون رہتا ہے یہاں یہ بھی نہ دیکھا تم نے — میرے خوابوں کا حسیں شہر گرانے سے قبل
اپنے ہاتھوں سے گرانے ہی نہ پڑ جائیں کہیں — سوچ لینا در و دیوار اٹھانے سے قبل
آخری سعی بھی ناکام ہوئی تھی یارو — آخری ڈوبتا اک شخص بچانے سے قبل

دلِ بے حال کا کیا ذکر کروں میں تنویرؔ
شاخ تازہ تھا یہ تو عشق جتانے سے قبل

☆

جب تری داستاں سناؤں گا — درد اپنا ، زباں بناؤں گا
شوق مچلا جو ڈوب جانے کا — تیری آنکھوں میں ڈوب جاؤں گا
مجھ سے ملنے پرندے آتے ہیں — اس لئے گھونسلہ بناؤں گا
ٹھان رکھی ہے کچھ بھی ہو جائے — آندھیوں میں دیا جلاؤں گا
باندھ رکھی ہے شرط دریا سے — پار کشتی کو میں لگاؤں گا
درد کی بانسری میں ڈھل کے اک دن — میں ترا ہجر گنگناؤں گا
پہلے خود سیکھ لوں پرندوں سے — پیار پھر سب کو میں سکھاؤں گا

جا تجھے عشق میں سہولت دی
تجھ کو تنویرؔ بھول جاؤں گا

اس لئے چھوڑی نہیں ذات میں وحشت رکھنا
مجھ کو مجنوں کے قبیلے سے ہے نسبت رکھنا

اپنے دشمن پہ بھی آتا ہے مجھے پیار اکثر
مجھ کو آتا ہی نہیں کارِ عداوت رکھنا

کس کو رہتا ہے یہاں ہوش، مگر اہل خرد
کہہ رہے ہیں کہ محبت میں فراست رکھنا

جانے والے نہ ہی آتے ہیں نہ ہی آئیں گے
اب تو بے کار ہے ان کی کوئی حسرت رکھنا

یہ تو ہوتا ہے غلاموں کی طبیعت جیسا
کتنا آسان ہے اس دل پہ حکومت رکھنا

اور بھی دنیا میں ہیں لوگ بہت سے لیکن
اچھا ہے اہلِ محبت سے قرابت رکھنا

شوخیٔ گل ہے عیاں اس کی نظر سے اب بھی
اب بھی بھولا نہیں اندازِ قیامت رکھنا

ساتھ ہی جاتا ہے یہ نام ونسب کے تنویر
اتنا ہے زندہ کوئی حرفِ صداقت رکھنا

☆

کھڑے ہیں سامنے سرکار لیکن
نہیں ہے قوتِ گفتار لیکن

گرا ہے کٹ کے وہ سلطان بے شک
گری سر سے نہیں دستار لیکن

جہاں میں فن کبھی مرتا نہیں ہے
یہاں پہ مرتے ہیں فنکار لیکن

مجھے ہر دم میسر تشنگی ہے
ہوئے سیراب وہ ہر بار لیکن

زمانے ہم بڑے فنکار ہیں سن
بڑا ہے ہم سے تو فنکار لیکن

بچھڑ جائے زمانہ ہم سے چاہے
کبھی بچھڑے نہ پہلا پیار لیکن

محبت کی عطا میں کیا نہیں تھا
ہمیں اچھا لگا آزار لیکن

اگرچہ گفتگو کا لہجہ اور ہے
بتاتے ہیں کچھ اور آثار لیکن

کہانی مر بھی سکتی ہے یہ تنویر
نہیں مرتا کبھی کردار لیکن

چھدے ہوئے ہیں لبوں کے کنار حرفوں سے
جہاں پہ کھلتی کبھی تھی بہار حرفوں سے

خیال یار سے مہکی بہت مگر یارو
فضائے معنی ہوئی سوگوار حرفوں سے

غزل سے وصل کی سب لذتیں تو ظاہر ہیں
ٹپک رہا ہے مگر انتظار حرفوں سے

کہ چشم ضبط سے دریا بہانا پڑتا ہے
کبھی کیا اترا ہے دل کا غبار حرفوں سے

گھما پھرا کے نہ تم اپنے دل کی بات کرو
کہ اٹھ نہ جائے کہیں اعتبار حرفوں سے

میں جس کے حوصلے سے عمر بھر جیا تنویر
وہ کر گیا ہے مجھے سوگوار حرفوں سے

☆

کچھ ایسے جینے کی میں اب کے ابتدا کر لوں
اٹھا کے ہاتھ خود اپنے لئے دعا کر لوں

بھٹک چکا ہوں کئی بار کیا ہی بہتر ہو
اگر میں پہلے ہی معلوم راستہ کر لوں

یہی گلی تو ٹھکانہ ہے آخری میرا
اسی گلی میں چلو آخری صدا کر لوں

چراغ! خواب کے منظر میں کچھ نمایاں ہے
میں اپنی آنکھ ذرا اس سے آشنا کر لوں

قیام! شہر میں بہتر ہے یا کہ صحرا میں
ذرا میں شام سے پہلے یہ فیصلہ کر لوں

پھر اس کے بعد اڑوں گا کھلی فضاؤں میں
ذرا پرندوں کو میں اپنا ہم فضا کر لوں

سنا ہے حشر تلک یہ تو ساتھ دیتا ہے
تو کیوں نہ دوست ترے ہجر کی دعا کر لوں

موسمِ وصل کو بے شک نہ پکارو لوگو　　شاخِ امید سے گل تو نہ اتارو لوگو
کاسۂ وقت میں ظلمت کے سوا کچھ بھی نہیں　　آس کی جھولی کو اتنا نہ پسارو لوگو
وہ جو خوشبو کی طرح دست ہوا میں ہے اسے　　کہیں سے لاؤ مرے خواب سنوارو لوگو
میں بھی مجنوں کے قبیلے سے ہوں چاہے مجھ کو　　آزمائش کے شکنجوں سے گزارو لوگو
کوئی مہتاب کہیں سے اتر آئے شاید　　قریۂ جاں کی ہر اک راہ سنوارو لوگو

اس کی آنکھیں ہیں کسی گہرے سمندر جیسی
ڈوبنے دو مجھے ان میں نہ ابھارو لوگو

☆

جو درد دے کسی کو بھلا آدمی نہیں　　بے فیض زندگی تو کوئی زندگی نہیں
کیوں لوگ میرے نام سے منسوب کرتے ہیں　　جو بات میرے بابِ ہنر میں لکھی نہیں
وحشتِ شبِ فراق کا اک بے اماں سفر　　طے کر رہے ہیں پر یہ کوئی زندگی نہیں
کب سے دہک رہا ہے الاؤ وجود کا　　کب سے کسی خیال کی چادر تنی نہیں
جو ہو سکے تو ہجر رتیں ہی اتار دے　　اس موسمِ وصال سے اپنی بنی نہیں
کوئی نہیں ہے گوش بر آواز نہ سہی　　ہم نے بھی دل کی بات کسی سے کہی نہیں
یہ میں جنونِ عشق میں خاموش رہتا ہوں　　مت بدگمان ہو یہ مری خود سری نہیں
ہر روز میں تو جاتا ہوں اس کی تلاش میں　　میرے لئے یہ بات تو کوئی نئی نہیں

کیوں اس کو بے وفائی کا تنویرؔ دوش دوں
یہ میرا عشق بھی تو کوئی آخری نہیں

یہ اشک شاخ شاخ پروئے ہیں مدتوں
کہ تیرے دکھ گلاب بھی روئے ہیں مدتوں

اے آہ نیم شب ترے اشکوں کی اوس سے
دامن دعائے غم کے بھگوئے ہیں مدتوں

ہم نے ہی رتجگوں کے اگائے ہیں ماہتاب
پاؤں پسار کے ہمی سوئے ہیں مدتوں

کچھ تو غمِ حیات ہمارا خیال بھی
ہم بھی ترے خیال میں کھوئے ہیں مدتوں

مہر و وفا کے بدلے میں انبار درد کے
اس زندگی کی پیٹھ پہ ڈھوئے ہیں مدتوں

☆

رخصت کے وقت دی تھی فقط اک دعا مجھے
سارے سفر میں جس کا رہا آسرا مجھے

بکھرا ہوں رہگزر میں تری خاک کی طرح
دھیرے قدم اٹھا نہ فضا میں اڑا مجھے

میں ٹوٹ کے گرا ہوں تری شاخِ وصل سے
گر ہو سکے تو شاخ پہ پھر سے لگا مجھے

تیری طرف بھی آؤں تو اب آؤں کس طرح
کیا وقت تھا کہ یاد تھا ہر راستہ مجھے

میں اجنبی سا شخص ترے شہر کیا گیا
اپنے سوا نہ کوئی ملا آشنا مجھے

شاخوں سے ٹوٹنا ہی مقدر ہے کیا کریں
روتے ہوئے گلاب نے اتنا کہا مجھے

جلتے ہوئے چراغ میں ڈھلنے کی دیر تھی
پھر تو ہوا کے دوش پہ تھا رکھ گیا مجھے

یہ اور بات ہے کہ نہ دل کو ملا سکوں
ورنہ تسلیاں تو وہ دیتا رہا مجھے

مجھے مٹانے کی ہردم جو سازشوں میں رہا　عجیب بات ہے وہ پھر بھی دھڑکنوں میں رہا
اسی لئے تو یہ آباد ہو نہ پایا کبھی　یہ دل جو ہجر کی ہر پل تباہیوں میں رہا
ہوائے نرم کی دستک سے مشعلیں تو بجھیں　مگر چراغ مرا روشن آندھیوں میں رہا
ترا جمال نظر آیا ہر طرف مجھ کو　ترا خیال مرے دل کے آئینوں میں رہا
بدل بدل کے وہ آئے اگرچہ پیراہن　ترا فسوں تو مگر سارے موسموں میں رہا
وہ ایک دریا جسے منزلیں نصیب ہوئیں　اور ایک وہ کہ جو پایاب راستوں میں رہا
اسے ابھاروں تو کیسے، بناؤں تو کیسے　جو عکس بن کے سدا میرے واہموں میں رہا

سب انتظار کے گھڑیال ہو گئے خاموش
پر ایک وعدہ جو اس دل کی ساعتوں میں رہا

☆

محبت کے وہ ہیرے بیچتا ہے　جو پلکوں کے ستارے بیچتا ہے
خود اس کے بچے محرومِ تمنا　جو لوگوں میں کھلونے بیچتا ہے
جسے ہم کرتے ہیں سیراب، آخر　وہی دریا ہمارے بیچتا ہے
اسے ملتی نہیں منزل کبھی بھی　وفاؤں کے جو وعدے بیچتا ہے
جدا کر کے کہانی سے وہ خود کو　ادھورے سے فسانے بیچتا ہے

نہ جانے کس قدر مجبور ہے، جو
سرِ بازار بچے بیچتا ہے

غمِ دنیا سے میرے دھیان میں آ
چھوڑ کر دھوپ سائبان میں آ

وہ کہ دل سے اترتا جاتا ہے
اے مرے عشق درمیان میں آ

شاخِ تازہ پہ پھول کی صورت
خواب مہکے ہیں گلستان میں آ

چاک داماں بلا رہے ہیں تجھے
آ! تو اب اپنے خاندان میں آ

مجھ کو پہچاننے لگی دنیا
جب سے بیٹھا ہوں اس کے دھیان میں آ

ضبط کا اب نہیں رہا یارا
اے مری خامشی بیان میں آ

گوندھ رکھی ہے عشق کی مٹی
نقشِ محبوب اب گمان میں آ

میں نے خالی رکھا ہے حجرۂ دل
آ کبھی تو بھی اس مکان میں آ

گرچہ اس کو بھلا چکا کب کا
پھر بھی رہتا ہے میرے دھیان میں آ

☆

شجر بالیدگی پانے کا ہر فن جانتا ہے
ہوا کے ساتھ مٹی کی بھی الجھن جانتا ہے

محبت پھول بن کر کھل اٹھی ہے ٹہنیوں پر
اکیلا میں ہی کیا سارا ہی گلشن جانتا ہے

بلاآخر رزق ہونا ہے اسے تپتی زمیں کا
بہت اچھی طرح آنکھوں کا ساون جانتا ہے

زمانہ پھینکتا ہے کس نظر سے چند سکے
یہ جس کے گرتے ہیں دامن میں وہ من جانتا ہے

برائے زیب و زینت آ گئے وہ روبرو جب
قیامت اس پہ کیا گزری یہ درپن جانتا ہے

قدم رکھتا ہوں میں قدموں پہ اس کے اس لئے بھی
فقیرِ عشق ہے اور میرا مدفن جانتا ہے

وہ کر لیتا ہے تنہائی میں سب دکھ سکھ کی باتیں
اکیلے پیڑ کا دکھ گھر کا آنگن جانتا ہے

اسے جب لوٹنا ہو گا وہ لوٹ آئے گا تنویرؔ
پرندہ گلستاں میں اپنا مسکن جانتا ہے

اک نئے منظر میں منظر دیکھنا　فکر کی سیڑھی لگا کر دیکھنا
خواب میں ہے فتح و نصرت کی نوید　یہ ابابیلوں کا لشکر دیکھنا
ایک آئینے کو رکھنا سامنے　اور سمندر سے سمندر دیکھنا
بھول جاتا ہوں اگر دیکھوں اسے　اس کو تھا بس آنکھ بھر کر دیکھنا
تم چراغوں کو جلانا جب کبھی　تو ہوا کا رخ برابر دیکھنا
کیا ستم ہے جاگتی آنکھوں سے خواب　دیکھنا اور زندگی بھر دیکھنا
یہ مری تصویر. کرتی ہے کلام　اپنے کمرے میں لگا کر دیکھنا
مجھ کو خوش آتا ہے خود کو ہر گھڑی　سب سے اعلیٰ سب سے بہتر دیکھنا

تیسری آنکھ اس گھڑی کھلتی ہے جب
چاہتا ہوں اپنے اندر دیکھنا

☆

سارے چمن کے پھولوں کی حالت بدل گئی　جس لمحے باغبان کی نیت بدل گئی
ہم اب بھی روز ملتے ہیں اسی اک تپاک سے　لیکن تعلقات کی صورت بدل گئی
اب کے بجھا سکی نہ ہوا بھی مرے چراغ　اب کے ستم کی کہنہ روایت بدل گئی
اکثر ترے بھی پاس نہ آنے کا تھا جواز　اکثر مری بھی ملنے کی نیت بدل گئی
میں عشق تھا سو دشت میں بھی عشق ہی رہا　بس یہ ہوا کہ میری سکونت بدل گئی
مشہور تجھ سے ملنے سے پہلے بھی تھا مگر　اب یہ ہوا کہ صورتِ شہرت بدل گئی
یہ دشت کا قیام مجھے راس آ گیا　میں پرسکون ہوں مری حالت بدل گئی
پھر یوں ہوا کہ یاد کا سورج بھی ڈھل گیا　پھر یوں ہوا کہ شامِ اذیت بدل گئی

پہلے تو وہ گریزاں رہا مجھ سے، اس کے بعد
تنویر مجھ سے اس کی محبت بدل گئی

شبِ تاریک کو سحر میں رکھ　　پسِ منظر کو بھی نظر میں رکھ
گو نہیں ہے مصدقہ لیکن　　اس خبر کو بھی اک خبر میں رکھ
آسماں کی خبر جو رکھتے ہیں　　وہ پرندے ضرور گھر میں رکھ
اپنی تشکیل کے لئے اپنی　　خاک کو دستِ کوزہ گر میں رکھ
اے میاں عشق ہے بنائے زیست　　عشق کر اس کا سودا سر میں رکھ
ایسے شاید نمو یہ پا جائے　　درد کو سایہء شجر میں رکھ
وصل مانگا ہے تو بچھڑنے کا　　حوصلہ بھی دل و جگر میں رکھ
راستے ہمرکاب خود ہوں گے　　تو فقط پاؤں کو سفر میں رکھ
آکسیجن خود اپنی پیدا کر
چار پودے تو اپنے گھر میں رکھ

☆

جنون زاد ہوں فرہاد کے قبیل سے ہوں　　مقامِ عشق پہ پہنچا اسی دلیل سے ہوں
شجر کی چھاؤں پہن کر جو آج بیٹھا ہوں　　یہاں میں دشت میں اک دھوپ کی سبیل سے ہوں
مری تلاش تو اس واسطے بھی مشکل ہے　　مکینِ دشت ہوں اور حلقہء قلیل سے ہوں
وقارِ نطق ہے قائم مری خموشی سے　　میں اپنے شعر کے ہر لفظ کی دلیل سے ہوں
میں اک پرندہ سنہرے پروں میں لپٹا ہوا　　نکل کے آیا ہوا اس نظر کی جھیل سے ہوں
مری سرشت میں حق گوئی ہے رچی تنویر
وہ جن سے سجتے ہیں مقتل اسی قبیل سے ہوں

سامنے والی گلی سے جو گزر ہو جائے
عین ممکن ہے اسے میری خبر ہو جائے

پھول تم لائے تھے اک بار محبت والے
ہاں یہی کام اگر بارِ دگر ہو جائے

سوچتے ہیں کسی صحرا کی زمیں پر بیٹھے
اس سرائے میں اگر اپنا بھی گھر ہو جائے

دو گھڑی تو جو چلا آئے سرِ دشتِ خیال
تیرا کیا جائے مگر میری بسر ہو جائے

دیر تک جاگنے سے بھی شبِ غم کٹتی نہیں
تو اگر ساتھ ہو تو پل میں سحر ہو جائے

چاہتا تھا اسے محدود رکھوں آنکھوں تک
کیا کروں پھر بھی اگر دل پہ اثر ہو جائے

اس لئے بھی میں تمنا کو لہو دیتا ہوں
بارور ایسے ہی شاید یہ شجر ہو جائے

کیسے پہچانوں میں تنویرؔ اسے کہ وہ تو
کبھی خورشید کبھی مثلِ قمر ہو جائے

☆

ہو گیا اس لئے بھی ڈوبنا منظور مجھے
جھیل کے چاند نے تھا کر دیا مجبور مجھے

یہ مرے خوابِ پریشاں مری انگلی تھامے
لے گئے شہرِ محبت سے بہت دور مجھے

اپنی شب کے لئے لیتے تھے اجالے مجھ سے
آج وہ چھوڑ گئے کر کے ہیں بے نور مجھے

میں اکیلا نہیں وہ بھی ہے گرفتارِ وفا
بس اسی بات نے کر رکھا ہے مغرور مجھے

خواب میں آتے ہیں ملتے وہ حقیقت میں نہیں
اک سبب یہ بھی ہے جو رکھتا ہے رنجور مجھے

میں کہ گمنام سا شاعر تھا غزل کا لیکن
کر دیا جانِ غزل ، آپ نے مشہور مجھے

میں گرفتارِ بھنور میں ہوں تو کس سے پوچھوں
کون لایا ہے کناروں سے یہاں دور مجھے

ہجر کا گھاؤ کسی طور بھی بھرتا ہی نہیں
مار ڈالے گا کسی روز یہ ناسور مجھے

وہ کیا نہیں تھا زمیں میں جو آسمان میں تھا
یہی سوال تو کب سے مرے گمان میں تھا
مرا وجود ہدف ہے اسی ستم گر کا
وہ جس کی ذات کا ہر پل مری امان میں تھا
دلِ تباہ شدہ کی تسلیوں کے لئے
مرا یہ عشق مرے ساتھ اس مکان میں تھا
اس ایک فرق سے تو جنگ ساری جیتا تھا
جو ایک فرق ترے اور مرے بیان میں تھا
شجر کے سائے میں بیٹھا تو میں نے یہ دیکھا
کہ سائبان تو اک اور سائبان میں تھا
کیا جو عشق ، گیا دشت تو ہوا معلوم
یہی مرض تو مرے سارے خاندان میں تھا
عجب بات ہے مجھ سے چھپا رہا ہے وہی
جو ایک شخص ہمیشہ سے میرے دھیان میں تھا
بدن کی قید سے نکلا تو اب یہ سوچتا ہوں
وہ اک جہان جو آباد خاکدان میں تھا

☆

سفر کی رائیگانی مار دے گی
مجھے اک بدگمانی مار دے گی
مرا کردار تو زندہ رہے گا
مجھے لیکن کہانی مار دے گی
مرے بچپن مجھے باہوں میں لے لے
وگرنہ یہ جوانی مار دے گی
میں کچھ دن اور زندہ رہ سکوں گا
کسی کی پھر نشانی مار دے گی
مرے غم تو سلامت رہنا ورنہ
مجھے یہ شادمانی مار دے گی
مقلّد ہوں کسی مجنوں کا میں بھی
مجھے بھی رت سہانی مار دے گی
محبت روح میں بستی ہے ، مجھ کو
محبت کی گرانی مار دے گی
کوئی لمحہ خوشی کا ورنہ تنویرؔ
غموں کی جاودانی مار دے گی

کہانی ابتدا کرنے سے پہلے ختم کرتے ہیں
محبت التجا کرنے سے پہلے ختم کرتے ہیں

محبت نارسائی ہے تو پھر اس محبت میں
دلوں کو مبتلا کرنے سے پہلے ختم کرتے ہیں

ہماری بے سخن باتیں اسے کیسے پہنچ پاتیں
کہ ہم تو رابطہ کرنے سے پہلے ختم کرتے ہیں

ہماری بات کا تجھ پر اثر ہی جب نہیں ہوتا
تو ملنے کی دعا کرنے سے پہلے ختم کرتے ہیں

محبت میں بہت دن تک ہمیں رہنا نہیں پڑتا
اسے کارِ وفا کرنے سے پہلے ختم کرتے ہیں

یہ تجدیدِ وفا اس بار بھی بے سود جائے گی
کہ تم سے رابطہ کرنے سے پہلے ختم کرتے ہیں

کبھی تنویرؔ ہر غم کو لگا لیتے ہیں سینے سے
کبھی غم کو سوا کرنے سے پہلے ختم کرتے ہیں

☆

جاگتی رات کے منظر کو مری آنکھ میں دیکھ
ایک خاموش سمندر کو مری آنکھ میں دیکھ

جس نے بے نام رکھا شہر کی گلیوں میں مجھے
مجھ سے موسوم اسی در کو مری آنکھ میں دیکھ

میری بے نور سحر پر جو کبھی رویا تھا
آج اس عکسِ گلِ تر کو مری آنکھ میں دیکھ

یہ شکستہ در و دیوار یہ اجڑے کمرے
خواہشوں کے مرے اس گھر کو مری آنکھ میں دیکھ

بال و پر نوچ لئے اگرچہ ہوا نے تو کیا
میری پرواز کے جوہر کو مری آنکھ میں دیکھ

جس نے اس روح میں الفت کے کھلائے ہیں پھول
اس مرے عشق کے منتر کو مری آنکھ میں دیکھ

جو تھا لہرایا جدا ہو کے مرے پہلو سے
دل لہو چاٹتے خنجر کو مری آنکھ میں دیکھ

جس کے ہونے سے میں برباد ہوں اب تک تنویرؔ
تو اسی خواہشِ خود سر کو مری آنکھ میں دیکھ

کیا نیا میں استعارہ دیکھتا ہوں
اس محبت میں خسارہ دیکھتا ہوں

اک نئے طوفان کے آنے سے پہلے
اس دریچے سے اشارہ دیکھتا ہوں

جب بھٹکنے کا میں کرتا ہوں ارادہ
اوج پر اپنا ستارہ دیکھتا ہوں

چشمِ حیرت میں اتر کر زندگانی
تیرے امکاں کا کنارہ دیکھتا ہوں

بیٹھ جاتا ہوں وہیں پر ناتواں سا
گر کہیں کوئی سہارا دیکھتا ہوں

عالمِ موجود میں اک اور منظر
چشمِ امکاں سے دوبارہ دیکھتا ہوں

جھانکتا ہوں جب کبھی بھی اپنے اندر
اک نیا پھر میں نظارہ دیکھتا ہوں

☆

یہ کس کی زباں بولنے لگ گیا ہوں
یہ رک کر میں کیا سوچنے لگ گیا ہوں

کسی وادیء قاف میں ہوں میں شاید
عجب جو سماں دیکھنے لگ گیا ہوں

کئی راہیں کھلتی ہیں روزانہ مجھ پر
کئی راز میں بوجھنے لگ گیا ہوں

طبیعت میں سنجیدگی آ گئی ہے
یہ خاموشی جو اوڑھنے لگ گیا ہوں

میں چل بھی نہ سکتا تھا لیکن اچانک
کسے دیکھ کر دوڑنے لگ گیا ہوں

گلا کیا کروں میں تری ہمرہی سے
میں خود کو بھی تو روکنے لگ گیا ہوں

تو ایسا ہے، ویسا ہے، کیسا ہے تنویر
ترے بارے کیا سوچنے لگ گیا ہوں

پیاس پلکوں پہ جمی ہے اب بھی — آنکھ پانی سے بھری ہے اب بھی
دل کے دالان میں بے وقت سہی — یاد کی دھوپ کھلی ہے اب بھی
جل گیا سارا اثاثہ گھر کا — ایک تصویر لگی ہے اب بھی
بے وفا میری وفا کا مرکز — تو ہی تھا اور تو ہی ہے اب بھی
شہر خاموش ہوا ہے لیکن — اک صدا گونج رہی ہے اب بھی

کل بھی تنویرؔ کمی تھی اس کی
مجھ کو محسوس ہوئی ہے اب بھی

☆

منزلِ راہِ وفا کتنی کڑی تھی — ہر قدم ریوار رنج و غم کھڑی تھی
تیرا ملنا معجزے سے کم نہیں تھا — اور بچھڑنا بھی قیامت کی گھڑی تھی
راہ الفت کے سفر میں آبلہ پا — اب کی دفعہ تو محبت رو پڑی تھی
دل سمندر میں تھی تو ، تھی یاد تری — آنکھ میں اتری تو ساون کی جھڑی تھی
جب گرا تھک کر سفر سے میں ، تو دیکھا — اک مسافت دور کی اب بھی پڑی تھی

بجھ گئی ہے اب اگر تو کیا ہوا پھر
شمع اک حد تک ہواؤں سے لڑی تھی

لہو لہو ہی سہی خواب زندگانی کے
میں ان کو پھول سمجھتا ہوں باغ فانی کے

اداس چاند، سمندر، بھنور میں ڈوبتی ناؤ
یہی تو بولتے کردار ہیں کہانی کے

بلاتا رہتا ہے وہ دعوتِ نظارہ پر
بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے میزبانی کے

ابھی یہ موسمِ گل کو نہیں ہوا معلوم
مری نظر میں نہیں خواب شادمانی کے

نہ جانے کیوں ہمیں تیرا یقین آنے لگا
کہ ہم تو عشق میں قائل تھے بدگمانی کے

نہ جانا دوست مرے ان سفید بالوں پر
کہ میرے پاس بہت خواب ہیں جوانی کے

میں کیسے دوں انہیں تنویؔر آنسوؤں کا نام
کہ میری آنکھ میں کھلتے ہیں پھول پانی کے

☆

جب بھی کبھی ہمارے پر و بال کٹ گئے
رستے ہمارے سامنے تنویؔر ڈٹ گئے

ایسی کدورتوں کی ہوا تھی کہ دفعتاً
ہم اہل کارواں کئی حصوں میں بٹ گئے

دشت جنوں میں عزم سفر کا کمال تھا
جو فاصلے تھے چشمِ زدن ہی میں کٹ گئے

کتنے عجیب لوگ تھے کیا جانے سوچ کر
منزل قریب آئی تو واپس پلٹ گئے

اک جھونکا رنجشوں کا ادھر آیا دوستو!
ان کی نوازشوں کے جو بادل تھے چھٹ گئے

اور تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ایک بس اس سے رابطہ ہی نہیں
میں خدا کس طرح کہوں اس کو جو صداؤں پہ بولتا ہی نہیں
گل کی موجودگی کا کیا کہیئے اب ہوا سے وہ سلسلہ ہی نہیں
ہر گھڑی میرے پاس رہتا ہے وہ مرا جس سے رابطہ ہی نہیں
مدتیں ہو گئیں کسی کا خیال شاخِ امکاں پہ جھولتا ہی نہیں
میں تو صدیوں سے دسترس میں ہوں وہ مگر مجھ کو ڈھونڈتا ہی نہیں
کون سا روگ پال رکھا ہے ایسا چپ ہے کہ بولتا ہی نہیں
کسی اپنے سے یوں جدا ہونا واقعہ ہے کہ بھولتا ہی نہیں
وقت جیسے ٹھہر گیا تنویرؔ
یہ کسی سمت گھومتا ہی نہیں

☆

مکاں اور لا مکاں کے بیچ کچھ ہے زمیں اور آسماں کے بیچ کچھ ہے
ہے تم دونوں کی خاموشی سے ظاہر ترے اور رازداں کے بیچ کچھ ہے
یونہی بد دل نہیں میں ذرا دیکھ عدو اور مہرباں کے بیچ کچھ ہے
کہا منصف نے سن کر سب دلائل کہ تیری داستاں کے بیچ کچھ ہے
یونہی تو انگلیاں اٹھتی نہیں ہیں عوام اور حکمراں کے بیچ کچھ ہے
محبت سود بھی ہے اور زیاں بھی اور اس سود و زیاں کے بیچ کچھ ہے
کھنچا جاتا ہے یہ دل اس کی جانب
مرے اس جان جاں کے بیچ کچھ ہے

دریاؤں کی روانی اتر آئی آنکھ میں
یہ کیسی خوں فشانی اتر آئی آنکھ میں

اک جلتے شوخ پھول کی ہستی کو دیکھ کر
ہر شخص کی جوانی اتر آئی آنکھ میں

جب ہجر کے خیال سے دونوں ملول تھے
اس رات کی کہانی اتر آئی آنکھ میں

سب راز دل کے ہو گئے افشا اسی گھڑی
جب اس کی بے زبانی اتر آئی آنکھ میں

اک وسوسے نے اٹھا دیا طوفان دل کے بیچ
اک موجِ رائیگانی اتر آئی آنکھ میں

ٹھہرے ہوئے ہیں اشک کسی کی جدائی کے
یا درد کی نشانی اتر آئی آنکھ میں

تنویرؔ رائیگاں ہوئیں میری عبادتیں
جس وقت بدگمانی اتر آئی آنکھ میں

☆

گرمئ شوق سے گھبرائے ہوئے لوگ ہیں ہم
اپنے ہی سائے سے شرمائے ہوئے لوگ ہیں ہم

لفظ سے لفظ ابھی جوڑ کے خوش ہوتے ہیں
اتنی سی بات پہ اترائے ہوئے لوگ ہیں ہم

ہم سخن زاد ہم آواز اٹھانے والے
اپنے ہی خون میں نہلائے ہوئے لوگ ہیں ہم

بات کرتے ہیں تو یہ صاف نظر آتا ہے
وعدۂ فردا پہ بہلائے ہوئے لوگ ہیں ہم

زیست بے داد طلب خواہشیں بے نام و نمود
عہدِ کج فہم کے دہرائے ہوئے لوگ ہیں ہم

ہم نہ بھی ہوں تو کوئی فرق نہیں ہے کہ یوں بھی
بے سبب زیست کو پہنائے ہوئے لوگ ہیں ہم

زرد رو اس لئے آتے ہیں نظر سچ جو کہوں
ہالۂ درد کے گہنائے ہوئے لوگ ہیں ہم

حلقۂ رنگ بہاراں سے بہت دور ہیں کہ
درِ دیوار میں چنوائے ہوئے لوگ ہیں ہم

کس سفر میں ہم سفر ہیں چاندنی میں اور وہ
ہیں عذابِ ہمرہی میں روشنی میں اور وہ

آ گئی ہے اب خلیجِ شک ہمارے بیچ سو
مبتلائے امتحاں ہیں دوستی میں اور وہ

عشق میں گزرے زمانے کی نشانی ہے میاں
پیڑ پر لکھا ہوا ہے دل لگی میں اور وہ

اپنی اپنی سمت ہم چلتے رہے شب بھر مگر
صبح ہونے پر کھلے تھے بے حسی میں اور وہ

آ گیا تھا ساتھ دینے کے لئے وہ شخص بھی
لگ گئے تھے جب کنارے بے بسی میں اور وہ

ایک گزرے موسمِ گل رنگ کی انگلی پکڑ
آ گئے ہیں کس جگہ پر خامشی میں اور وہ

اس محبت میں بچھڑ بھی سکتے ہیں یہ سوچ کر
کتنے حیراں ہیں جدائی کی گھڑی میں اور وہ

مدتوں سے شام ہوتے ہی بہم ہو جاتے ہیں
دشت کا مہتاب اک آوارگی میں اور وہ

پھر محبت کی سزا دینے کو دنیا آئی ہے
پھر سرِ مقتل کھڑے ہیں عاشقی میں اور وہ

☆

خزاں کے رنگ تھے حدِ بہار سے باہر
بھٹک گئے جو ہوئے ہیں قطار سے باہر

عجیب بات اسی کے میں اختیار میں ہوں
سدا سے جو ہے مرے اختیار سے باہر

وہی حصارِ محبت کا حصہ ہوتے ہیں
نکل جو پاتے نہیں ہیں حصار سے باہر

ملیں گی تجھ کو سدا منتظر ہی آنکھیں مری
درونِ دل ہو یا دل کے دیار سے باہر

مجھے بھی یاد کی صورت سنبھال کر رکھنا
کبھی نہ کرنا دلِ بے قرار سے باہر

وہ مجھ کو دیکھ رہا تھا کنارے آب کھڑا
کہ جیسے چاند کوئی آبشار سے باہر

جو مجھ میں رہتا ہے پھولوں کی طرح اس کے طفیل
کھلے ہیں زخم بدن پر شمار سے باہر

سکوتِ موجِ تمنا بتاتا ہے تنویر
اک انتظار ہے اس انتظار سے باہر

ٹوٹا جو بندِ چشم ، سہارا نہیں رہا
دریا کا یعنی کوئی کنارہ نہیں رہا

یہ کہہ کہ اک سفر سے پرندے پلٹ گئے
اب اور تھکان سہنے کا یارا نہیں رہا

یہ دل دھڑکتا آج بھی ہے اس کے نام پر
کیسے یہ مان لیں وہ ہمارا نہیں رہا

باغِ انا کا مہکا ہوا میں وہ پھول ہوں
کہ جس پہ اختیار تمہارا نہیں رہا

کیا سارے ہی سفیر اجالوں کے مر گئے
جو آسماں پہ کوئی ستارا نہیں رہا

بارود کس نے دے دیا بچوں کے ہاتھ میں
کہ ان کے ہاتھ میں جو غبارہ نہیں رہا

لگتا ہے ڈوب جاؤں گا میں غم کے دریا میں
گر آپ کی نظر کا اشارہ نہیں رہا

اس نے فقط یہ بات کی اور کھل کے رو دیا
اب اس جہان میں مرا پیارا نہیں رہا

میں اس فرازِ حسن کا اے دوست کیا کروں
جب آنکھ میں ہی شوقِ نظارہ نہیں رہا

دنیا کا روپ ہی مرے آگے بدل گیا
جو ایک دل میں جان سے پیارا نہیں رہا

☆

شہر کو آباد ہونا تھا پہ بنجر رہ گیا
جیسا پہلے تھا کبھی ویسا ہی منظر رہ گیا

غم کا پتھر تھا سرِ مژگاں کوئی ٹھہرا ہوا
لوگ سمجھے تھے کہ جم کر کوئی اختر رہ گیا

اس کے ہونے سے کئی منظر نمایاں تھے مگر
اور نہ ہونے سے بچھڑ جانے کا منظر رہ گیا

وہ تو جاتے ہی پلٹ آیا یہ میں حیران ہوں
اتنی جلدی کس طرح سب کچھ بدل کر رہ گیا

ایک حسرت نامکمل رہ گئی اس شخص کی
اور تشنہ ایک جذبہ میرے اندر رہ گیا

میرے حصے میں غموں کی پوٹلی آئی مگر
دریا کے اس پار میرا سارا ہی گھر رہ گیا

میں سپاہِ عشق میں تھا سو مجھے منزل ملی
اور خرد مندوں کا جو لشکر تھا پھنس کر رہ گیا

ہونٹ پر انگلی رکھی اور کہہ دیا کہ چپ رہو
اور میں دل کی دل میں رکھ کر کسمسا کر رہ گیا

رقصاں دلِ بے کل میں جو وحشت ہے ابھی تک
اس شغل کا موجب وہی صورت ہے ابھی تک

تیرا تو میں اک عمر سے ممنونِ کرم ہوں
اے عشق تری مجھ پہ حکومت ہے ابھی تک

جو آج بھی سجدے میں پڑے شمس و قمر ہیں
یہ عشق ہی مصروفِ عبادت ہے ابھی تک

بے چین طبیعت سے تری ہوتا ہے ظاہر
جیسے کہ تجھے میری ضرورت ہے ابھی تک

لوٹ آیا ہوں یہ سوچ کے اس شہر میں واپس
اغلب ہے اسے مجھ سے محبت ہے ابھی تک

پھر چھوڑ کے جانے کے لئے چاہو تو لوٹ آؤ
اے دوست میسر یہ سہولت ہے ابھی تک

گزرے ہوئے لوگوں سے ملا کرتا ہوں میں روز
اک خوابِ مسلسل کی عنایت ہے ابھی تک

بیٹھا ہے مرے سامنے تصویر کی صورت
اس شوخ کی آنکھوں میں شرارت ہے ابھی تک

گو جسم مرا برف کی سل ہو گیا تنویر
آنکھیں کہ بھری جن میں حرارت ہے ابھی تک

☆

سمندر میں سمندر جاگتا ہے
کہ یہ منظر میں منظر جاگتا ہے

فلک کے چاند سے ہے یہ بھی نسبت
یہ میرے ساتھ شب بھر جاگتا ہے

اتر جاتا ہوں گہری نیند میں جب
مرے خوابوں کا پیکر جاگتا ہے

وہ گھر بھی جانتا ہوں میں جہاں کے
مکیں سوتے ہیں اور گھر جاگتا ہے

میں جب بھی بند کر لیتا ہوں آنکھیں
تری رخصت کا منظر جاگتا ہے

کسی کا غم بسر کرنا ہے جس کو
عجب کیا گر وہ شب بھر جاگتا ہے

یہ کیسا درد ہے جس کو سلاؤں
تو یہ پھر باہر آ کر جاگتا ہے

چڑھائی صبح دم کرنی پڑے تو
ابابیلوں کا لشکر جاگتا ہے

زمانہ سو رہا ہوتا ہے جس دم
تو اس دم اک قلندر جاگتا ہے

اکیلا شب گزیدہ کب ہوں تنویر
مرا غم بھی برابر جاگتا ہے

نظر سے آگے رستہ ڈولتا ہے کہ میرے دل کا صحرا ڈولتا ہے
خمارِ خواب سے باہر نکل کر ترا خوابیدہ لہجہ ڈولتا ہے
بپا ہے ایک طوفاں دل میں، جس سے بدن کا سارا خیمہ ڈولتا ہے
لرزتی ہے یہ ناؤ پانیوں پر کہ دریا کا کنارہ ڈولتا ہے
سہارہ مل گیا پر کیا کروں میں بنا ہے جو سہارہ ، ڈولتا ہے
مری یہ ڈبڈباتی آنکھیں، جن میں بچھڑتا ایک چہرہ ڈولتا ہے
نظر آتا ہے لرزاں عہدِ فردا کہ یہ گزرا زمانہ ڈولتا ہے
ہمیشہ ہجر کے قصّے میں تنویر
محبت کا حوالہ ڈولتا ہے

☆

عشق پھر سے نیا اک ظرف پہن کر آیا
آزمائش کا اسی درجہ اسے طوق ملا جب تھا ہارا تو وہ پھر حرف پہن کر آیا
آتشِ عشق سے جلتا تھا بدن میرا اور جو یہاں جتنا بڑا ظرف پہن کر آیا
سرِ محفل تھا وہی بولنے والا چہرہ اپنے جذبات پہ وہ برف پہن کر آیا
اس قدر حسنِ تکلم نہ تھا اس میں تنویر خامشی کے جو یہاں حرف پہن کر آیا
وہ کسی اور کا تھا ظرف پہن کر آیا

حسابِ بیش وکم سے بھی زیادہ کر کے آیا ہوں
سفر اپنا میں سارا پا پیادہ کر کے آیا ہوں

ہرے جنگل کے پیڑوں میں رہوں گا پیڑ کے جیسا
میں اک ایسے ہنر سے استفادہ کر کے آیا ہوں

بہ زعمِ عشق خود کو ٹوٹ جانے سے بچا لوں گا
میں اب کی بار یہ پختہ ارادہ کر کے آیا ہوں

یقیں! مانو مرے قدموں میں ہوں گی منزلیں ساری
جنوں پیشہ، جنوں کا پھر اعادہ کر کے آیا ہوں

یہ صحرا ہجر کا، کرتا ہے یوں میری قدم بوسی
میں اپنے عشق کو منزل کا جادہ کر کے آیا ہوں

یہ میرے زخم کیسے کوئی پہچانے بھلا تنویرؔ
جب ان پر میں تبسم کا لبادہ کر کے آیا ہوں

☆

توڑ کر ہجر کے پتھر سے نکل آیا ہے
اشکِ غم آنکھ کے منظر سے نکل آیا ہے

تیرگی اوڑھے ہوئے سوتا رہا ہے سورج
اور اب رات کے بستر سے نکل آیا ہے

عکسِ آئینہ میں ہے میرا مخاطب یا پھر
مجھ میں تھا اور مرے اندر سے نکل آیا ہے

کرۂ زیست میں کچھ روشنی کرنے کے لئے
نور سا خاک کے پیکر سے نکل آیا ہے

بھر رہا ہے جو اڑانیں تو یہ لگتا ہے مجھے
کہ پرندہ ترے محور سے نکل آیا ہے

کون لایا ہے اسے کھینچ کے باہر تنویرؔ
یہ سفینہ جو سمندر سے نکل آیا ہے

یقیں کروں تو اسی بات میں صداقت ہے
یہاں کسی کو کسی سے کہاں محبت ہے

خزاں کی دھوپ میں شاخوں پہ گر سکونت ہے
تو یہ پرندوں کی پیڑوں سے خاص الفت ہے

مرے بدن میں محبت نے خوب پائی نمو
کہ اس شجر کو یہاں پر بڑی سہولت ہے

زمیں کو پیٹھ پہ لادے میں خود کو کھینچتا ہوں
یہ حوصلہ بھی مرے عشق کی بدولت ہے

کروں تو چین نہیں، بے کلی ہے چھوڑنے میں
مرے خدا یہ محبت بھی کیا مصیبت ہے

برا نہ مان محبت میں جان جائے گی
یہ میرا قول نہیں ہے یہی حقیقت ہے

تجھے میں سوچ بھی سکتا ہوں، دیکھ سکتا ہوں
یہ عہدِ قحطِ محبت بڑی سہولت ہے

میں اپنی نیند کے کھونے سے یوں پریشاں ہوں
کہ جیسے میری کسی خواب میں سکونت ہے

میں کیوں دھمال نہ ڈالوں دیارِ مقتل میں
اگر جنوں میں میسر مجھے سہولت ہے

☆

فضائے حبس میں جھونکا بہت ضروری ہے
ہے کیوں ضروری سمجھنا بہت ضروری ہے

ہمیں فریبِ نظر سے نکالنے کے لئے
ہماری سمت کو آنا بہت ضروری ہے

پکارنا ہے ہمیں گر گئے زمانے سے
تو پھر ہمارا ہی لہجہ بہت ضروری ہے

اسے یقین ہے اس پر، میں ہوں تماشہ گر
سو اب تماشہ لگانا بہت ضروری ہے

وفورِ عشق کی وسعت کو ماپنے کے لئے
فراقِ یار کا صحرا بہت ضروری ہے

اگر نکلنا ہے باہر پرانے دھوکے سے
تو دوست اک نیا دھوکہ بہت ضروری ہے

خود اپنی ذات کے رستے تلاشنے کے لئے
مرا مجھی میں اترنا بہت ضروری ہے

یہ خشک رستہ رکاوٹ مرے سفر میں ہے
مری روانی کو دریا بہت ضروری ہے

برونِ ذات جو منظر تراشنا چاہو
درونِ ذات بھی ہونا بہت ضروری ہے

فلک کا چاند سمجھتا ہے جانے کیا خود کو
تمہارا بام پہ آنا بہت ضروری ہے

عشق کی راہ میں بکھر کے سوچ
یعنی آنکھوں میں اشک بھر کے سوچ
خال و خد دیکھ حسن والے کے
اور کرشمے کسی ہنر کے سوچ
اس کے ہاتھوں میں پہلا پتھر تھا
کتنے پہلو ہیں اس خبر کے سوچ
کس لئے گو مگو کی حالت تھی
کیا تھے اسباب اگر مگر کے سوچ
کون ہے ساتھ ؟ کون چھوڑ گیا ؟
ہاتھ پر ٹھوڑی اپنی دھر کے سوچ
دھوپ ڈھلنے پہ چند لمحوں کو
فائدے سایہء شجر کے سوچ
دھوپ ، صحرا ، تھکن ، غبارِ سفر
سارے نقصان اس سفر کے سوچ
دل تھے کتنے فگار ، باتوں سے
کتنے زخمی ہوئے نظر کے ، سوچ
کتنی رنگیں ہے زندگی تنویر
روشنی سے یہ آنکھ بھر کے سوچ

☆

جو ہیں مایوس ان میں آرزوئیں بانٹتا ہے
وہ اہلِ گنگ میں اکثر زبانیں بانٹتا ہے
وہ جن کو جستجو ہوتی ہے غم کھائیں کسی کا
وہ ان میں درد سے بھرپور آنکھیں بانٹتا ہے
وہ پہلے آنکھ پر دیتا ہے اک ہلکی سی دستک
سنا ہے پھر وہ مصنوعی سی نیندیں بانٹتا ہے
شجر کاری نہیں کرتا اگا کر پیڑ بلکہ
یہی سچ ہے پرندوں میں وہ سانسیں بانٹتا ہے
محبت کو کبھی آزار مت سمجھو کہ یہ کام
جو کرتا ہے حقیقت میں امیدیں بانٹتا ہے
مری ساری اداسی کا سبب وہ آدمی ہے
محبت سے بھری جو مجھ میں شامیں بانٹتا ہے
مرے سارے اجالے سارے موسم ہیں اسی کے
مری تاریک راہوں میں جو صبحیں بانٹتا ہے
کھرچ دیتا ہے ذہنوں سے پرانے حرف سارے
پھر اس کے بعد تازہ کار سوچیں بانٹتا ہے
جو پلّے سے تو اک دھیلہ نہیں دینے کے حق میں
مگر لفظوں میں وہ سونے کی کانیں بانٹتا ہے
وہی خالق وہی مالک وہی رازق ہے تنویر
جو سوکھے پیڑ پر سرسبز شاخیں بانٹتا ہے

کڑی دھوپ میں بھی کوئی شجر نہ اسے ملا نہ مجھے ملا
کہ ریاضتوں کا کوئی ثمر نہ اسے ملا نہ مجھے ملا

لیا میں نے جامۂ گل پہن وہ ہوا کے روپ میں ڈھل گیا
کہ پراہنِ گلِ تازہ تر نہ اسے ملا نہ مجھے ملا

کیا ہم نے ہو کے الگ الگ نئے راستوں کا جو انتخاب
کوئی پر خلوص سا ہمسفر نہ اسے ملا نہ مجھے ملا

تھے ہمارے رستے جدا جدا اور الگ الگ تھے نشانِ راہ
کوئی رہنما کوئی راہبر نہ اسے ملا نہ مجھے ملا

کیا ایک دوجے کی سمت جو ہوا رائیگاں وہ سفر تمام
کسی جستجو کا کوئی ثمر نہ اسے ملا نہ مجھے ملا

کہیں آب بن کے پڑا تھا وہ کہیں میں بصورتِ گل پڑا
ہمیں جو ملاتا وہ کوزہ گر نہ اسے ملا نہ مجھے ملا

☆

جھیل میں اترا ہوا پیکر طلب کرتا رہا
اس کی آنکھوں سے یہ میں اکثر طلب کرتا رہا

جستجو رہتی تھی کل تک سر بچانے کی جسے
وہ اسی سر کے لئے پتھر طلب کرتا رہا

گو تراشے کوزہ گر نے موسموں کے خال و خد
میرا دل لیکن ترا پیکر طلب کرتا رہا

آنکھ کی پتلی میں اک منظر سمونے کے لئے
ایک منظر دوسرا منظر طلب کرتا رہا

اب اسے سودا کہیں عادت کہیں یا کیا کہیں
جو نہ تھا ممکن اسے اکثر طلب کرتا رہا

وقت نے اس کو سجایا میرے چہرے پر مگر
غم کی دولت وہ مرے اندر طلب کرتا رہا

جس کو فرصت رونقِ بازار سے ملتی نہ تھی
وائے حیرت دشت میں وہ گھر طلب کرتا رہا

اپنے لشکر میں خود اپنی سرخروئی کے لئے
میرا دشمن مجھ سے میرا سر طلب کرتا رہا

کب یہ چاہا تھا کہ میں چاند ستارہ ہوتا
میری خواہش تو فقط یہ تھی پرندہ ہوتا

میں سمندر بھی نہ ہوتا کوئی دریا ہوتا
کر کے سیراب کسی بستی کو گزرا ہوتا

میں دیا بن کے تری یاد میں جلتا ہوتا
اور تو اٹھکیلیاں کرتا کوئی جھونکا ہوتا

میری وحشت کی طلب کثرتِ غم تھی، سو ملا
گر، یہ کچھ اور طلب کرتی تو پھر کیا ہوتا

بس گئے آ کے مری آنکھ کی پتلی میں سبھی
کوئی موسم تو مری روح میں ٹھہرا ہوتا

کارِ دنیا نے مجھے باز رکھا ہے ورنہ
ہجر کی شام ہی میں عازمِ صحرا ہوتا

اپنے خوابوں کے گلابوں کو سجاتا میں جہاں
منزلِ عشق میں ایسا بھی دریچہ ہوتا

قیس و فرہاد سمجھتے ہمیں صحرا والے
عشق میں اپنا بھی کچھ ایسا حوالہ ہوتا

بن کے ساگر نہ رہی مجھ میں روانی باقی
اس سے بہتر تو کہیں تھا کہ میں دریا ہوتا

☆

جو شجر دھوپ کی تردید نہیں کر سکتے
وہ نئی صبح کی تائید نہیں کر سکتے

اب کہ جب کارِ وفا سے ہوئے تائب ہم لوگ
اب کسی عہد کی تجدید نہیں کر سکتے

ایک انبار سا ہے سوچوں میں تصویروں کا
سو ترے عکس کی تجرید نہیں کر سکتے

ہیں پرستار ترے مدتِ دیرینہ سے
ترے افکار پہ تنقید نہیں کر سکتے

تیرے لہجے میں محبت سے بغاوت ہے میاں
کسی صورت تری تائید نہیں کر سکتے

ناامیدی سے گندھا ہوتا ہے جن کا بھی خمیر
وہ دیے کو کبھی خورشید نہیں کر سکتے

ہائے وہ چاند سدا کو ہوا اوجھل ہم سے
عمر بھر کے لئے ہم عید نہیں کر سکتے

ان کو ملتا نہیں منزل کا نشاں، جو، تنویر
اپنے اسلاف کی تقلید نہیں کر سکتے

دریا ہے یا ہے کوئی سمندر سمیٹ لے
منظر میں ہے چھپا کوئی منظر سمیٹ لے

وہ خوش جمال خواب میں آیا ہوا ہے آج
جتنے سمیٹ سکتا ہے منظر سمیٹ لے

تحلیل کر رہا ہے جو وہ خوشبوؤں کے عکس
آنکھوں کی پتلیوں میں وہ پیکر سمیٹ لے

دنیا نہ جان جائے ترے رنج و غم کا راز
آنکھوں سے بہہ رہا ہے جو ساگر سمیٹ لے

اترا ہے دشت میں جو ابھی اس سے یہ کہو
بکھرے پڑے ہیں جو مہ و اختر سمیٹ لے

آتے ہوئے زمانے میں گر جانا ہے تجھے
جاتے ہوئے زمانے کے منظر سمیٹ لے

کوئی نہیں جو آئے سجانے کے واسطے
اے آنکھ اپنے خواب کا بستر سمیٹ لے

میں نے کہا نہ تھا تجھے پوری نہ آئے گی
چل اب تو اپنے پاؤں کی چادر سمیٹ لے

☆

محبتوں کا کبھی آفتاب ابھرے گا
اور ایک روز یہ نفرت کا کفر ٹوٹے گا

تم اپنا حرفِ دعا کھینچتے رہو پیہم
وہ بلیقین کسی دن قبول کر لے گا

دلِ تباہ پہ میں اس لئے بھی روتا ہوں
کوئی بھی گاہک اسے اب کہاں خریدے گا

پرانے شہر کا منظر بدل گیا کیسے
یہی سوال کسی روز سر اٹھا لے گا

ابھی تو لپٹا ہوا ہے یہ زرد بیلوں میں
یہ دل کا پھول کسی اور رت میں مہکے گا

میں اپنی آگ میں خود جل رہا ہوں مدت سے
مری طرح سے یہاں اور کون سلگے گا

ابھی میں اتروں گا اپنے بدن کے کمرے میں
وہ میرے دھیان میں پھر سیڑھیاں لگا لے گا

کچھ اس لئے بھی میں رکھتا ہوں سبز شاخوں کو
مجھے خبر ہے پرندہ مجھی پہ اترے گا

مری سرشت جدائی شناس ہے تنویر
کسی کا وصل مجھے بیچ میں مار ڈالے گا

تمہاری سمت یہ ہم جو مسلسل دیکھتے ہیں
دعا کے چاند کو سچ مچ مکمل دیکھتے ہیں

خدا جانے نظر کس کی لگی ہے جو مسلسل
کراچی شہر کو اب مثلِ مقتل دیکھتے ہیں

پڑے ہیں دھوپ کے صحرا میں بے یار و مددگار
اور اک جلتا ہوا سورج مسلسل دیکھتے ہیں

خزاں کی ساری رت اپنے بدن پر جھیلتے ہیں
شجر پھر شاخ پر اپنی کوئی پھل دیکھتے ہیں

ابھی تو کچھ رتوں کی بات ہے بچھڑے تھے ہم لوگ
اور اتنی جلد دل کا شہر جنگل دیکھتے ہیں

مجھے اس بزم میں جانا نہیں تنویر لیکن
تری منشا یہی ہے گر تو پھر چل دیکھتے ہیں

☆

کوئی شکوہ نہیں ہے مجھ کو اپنے مہرباں سے
اگرچہ دھوپ میں لایا وہ مجھ کو سائباں سے

نہ کیسے مانتا میں ڈوبنے کی اس خبر کو
اشارہ مل گیا تھا جو شکستہ بادباں سے

میں اس اک بات پر مقتل میں پہنچایا گیا ہوں
مجھے پیارا ہے وہ اک شخص ہی سارے جہاں سے

پڑے ہو ناامیدی میں تو پھر اتنا رہے یاد
کوئی امید رکھنا بھی نہیں اب آسماں سے

جھلستی دھوپ میں شاداب پیڑوں سا رہا میں
مگر ہر شاخ جل اٹھی مرے سوزِ نہاں سے

کچھ ایسی خشک سالی آ گئی تھی اب کے، تنویر
کبھی سیراب ہو پایا نہ دل نہرِ رواں سے

تنویر سیٹھی کا شمار نئی نسل کے نمائندہ شعراء میں سے ہوتا ہے اس حوالے سے ان کا کمال یہ ہے کہ بڑے ادبی مراکز سے دور رہ کر بھی انہوں نے اپنی شعری صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے اور نئے لب و لہجے سے اپنی تخلیقات کو منور اور روشن کیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی غزلیں گنجینۂ لفظ و معنی کے تناظر میں طلسماتی اثریت رکھتی ہیں اور اس کے تخلیقی ذہن کی زرخیزی کو بھی ظاہر کرتی ہیں اور پھر جو مضامین اس نے اپنی غزلوں میں باندھے ہیں وہ اس کی فکری و نظری سطحوں کی روشن دلیل بھی ہیں کہ وہ لفظی بازیگری اور ترکیب سازی میں جو مہارت رکھتے ہیں اس کا عملی ثبوت اس کے سارے شعری مجموعے ہیں اس پس منظر میں اس کی شاعری مصافِ ذلت کے ہر پہلو کا احاطہ کرتے ہوئے ایک ایسا مستند حوالہ بن جاتی ہے جس میں اس کا عصرِ رواں واضح طور پر بولتا اور عکس ریز ہوتا دکھائی دیتا ہے اور یہی وہ منظر ہے جو تنویر سیٹھی کی تخلیقی مفالیت کی بھرپور گواہی بھی ہے کہ جو اس کے لب و لہجے کی تازگی اور مضامین کی ندرت کی بنا پر اس کی سوچ و فکر کو منفرد احساسات اور مشاہدات کا حامل بنا دیتی ہے اور اس کا شعری سفر صحرا میں لپٹی دھوپ، زردرت کا چاند، صحرا میں پھول، چراغ میرے، ہم خیال ہیں اور کھلتے ہیں پھول پانی کے کی حیثیت میں ''حوالہ'' کی صورت میں افقِ شاعری پر روشن چاندی کی طرح نمودار ہو کر اپنی عصریت اور اثریت دکھاتا ہے اور یوں عصرِ بے چہر میں اس کی چہرنمائی اس کے ہونے کی خبر کا سبب سے بڑا حوالہ بن جاتی ہے اور اس کے ہونے کی گواہی ہے۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی

''حوالہ'' کے نام سے اس کا تازہ ترین مجموعہ غزل نئے رنگوں کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ اس کی یہ شاعری اس کے آتش بپا جذبوں اور خیال انگیز سوچوں پر محیط ہے..... غزل کی صنف ہی ایسی ہے کہ اس میں ذات کے اندر بھڑکتا الاؤ بھی منعکس ہوتا ہے اور زندگی اور زمانے کے محسوسات بھی کبھی شعلہ بن کر دہکتے ہیں اور کبھی پھول بن کر سامنے آتے ہیں..... تنویر سیٹھی کی غزل میں ذات سے زمانے کا سفر دھڑکتا ہے۔ اس کا کینوس وسیع ہے، اس لئے کہ اس میں تنویر سیٹھی اپنے باطن کی جولانیوں کے ساتھ خود بھی جھلکتا ہوا نظر آتا ہے اور زمانے کے دکھ، درد اور امید و یاس کے سلسلے بھی جلوہ ساماں ہیں۔ یوں اس کی شاعری زندگی سے جڑی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر مختار ظفر

تنویر سیٹھی عصر حاصر کا ایک ایسا حساس اور دردمند شاعر ہے جو تخلیقی سفر میں مشکل، کٹھن اور صبر آزما راستوں کا راہی ہے جسے حسب روایت شدید تنقید، طنز اور سنگ باری کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن آفرین ہے اس کے تخلیقی جذبے کا کہ اس اتنی مشکلات کے باوجود بھی ہمت نہیں ہاری۔ میں یقیناً یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ تنویر سیٹھی باہمت، توانا اور جوان جذبوں کا سچا اور بڑا شاعر ہے۔

قاسم خان

تنویر سیٹھی نوجوان نسل کے ان شاعروں میں شامل ہے جو دوستوں کی تحسین اور دشمنوں کی تنقیص سے بے نیاز جادۂ سخن پر مستقل مزاجی سے رواں دواں ہے اس کے فن میں غم جاں سے غم جہاں تک ان سارے رنگوں کا عکس جھلکتا ہے جو اچھی شاعری کا لازمہ ہیں۔ اور یہی خوبی اسے اپنے ساتھیوں میں نمایاں کرنے کے لئے کافی ہے۔

حسین سحر